بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشمولات

جولائی، اکتوبر ۲۰۱۳ء / جلد نمبر ۱۱، ۱۲

مدیر
محمد دین جوہر

نائب مدیر
نادر عقیل انصاری

مجلس ادارت
کاشف علی خان شیروانی
ڈاکٹر ظفر حیات
شاہد محمود

محمد دین جوہر، مدیر "جی" نے تایا سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور سے چھپوا کر حسن منزل، اردو بازار، لاہور سے شائع کیا۔

ضروری نوٹ:
اس شمارے میں قرآن حکیم کی آیات بھی شامل ہیں۔ ان کی درستی پر بساط بھر توجہ دی گئی ہے لیکن اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو براہ کرم ادارے کو مطلع فرمائیں۔

سہ ماہی جی لاہور ملنے کا پتہ:
کتاب محل
دربار مارکیٹ
لاہور
محمد فہد: 0321-8836932

برائے رابطہ، اظہارِ رائے و استفسار:
quarterlyjee@gmail.com

قیمت: ۱۵۰/روپے

قانونی مشیر:
کامنز لا کمپنی، نوائے وقت بلڈنگ، ۴۔ شارع فاطمہ جناح، لاہور

Commons Law Company, Nawa-e-Waqt Building
4-Shar'i Fatima Jinnah, Lahore

مسئلہ امامت، امارت اور خلافت

مولانا محمد ایوب دھلوی رحمۃ اللہ علیہ

ہمارا مضمون تینوں معنوں کو محیط ہے۔ پہلے ہم مسئلہ کی تشقیق کریں گے۔ خلافت یعنی خلیفہ کا تقرر واجب نہیں ہے یا واجب ہے۔ اگر واجب ہے، تو کس پر واجب ہے؟ اللہ پر یا بندوں پر یعنی مخلوق پر؟ اگر مخلوق پر بھی واجب ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں عقلاً واجب ہے یا شرعاً واجب ہے۔ پورے مسئلہ کا حصر عقلی کر لیا ہے تاکہ سہولت ہو جائے۔ چار ہی صورتیں ہیں۔ جتنے مذاہب ہیں، ان ہی چار صورتوں میں آ جائیں گے۔ کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔

- جو گروہ یہ کہتا ہے کہ اللہ پر واجب ہے، وہ اہل تشیع ہیں۔
- جو گروہ یہ کہتا ہے واجب نہیں ہے، وہ خوارج ہیں۔
- جو گروہ یہ کہتا ہے کہ بندوں پر واجب ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں جو گروہ یہ کہتا ہے کہ عقلاً واجب ہے وہ علمائے معتزلہ خیاط، جاحظ وغیرہ ہیں، اور جو اس کو شرعاً بندوں پر واجب کرتا ہے، وہ علمائے اہل سنت ہیں۔ امامت کے جتنے مسائل اور گروہ ہیں وہ ان ہی چار میں سے کسی ایک میں آ جائیں گے، مگر ہمیں گروہوں سے کوئی مطلب نہیں ہے، ہمیں تو اصل مسئلہ سے مطلب ہے۔

ہم نے حال ہی میں تحقیق کی ہے کہ یہ بات کہ خلافت کی ضرورت نہیں ہے، یہ غلط ہے۔ خلافت دراصل واجب کا مقدمہ ہے۔ "مقدمہ" اس شے کو کہتے ہیں جس پر کوئی شے موقوف ہو، تو یہ اس شے کا مقدمہ کہلائے گا۔ جیسے چھت موقوف ہے دیوار پر تو دیوار چھت کا "مقدمہ" کہلائے گا۔ "واجب" یا "ضروری" اس شے کو کہتے ہیں جس کے نہ ہونے سے ہلاکت واقع ہو جائے، اور جس شے کے نہ ہونے سے ہلاکت تو نہ ہو صرف تکلیف اور دکھ ہو اس کو "حاجت" کہتے ہیں۔ کپڑا نہ ہو تو تکلیف پائے گا، اور کھانا نہ ملے تو مر

جائے گا۔ تو کھانے کی ضرورت "واجب" ہے اور کپڑے کی "حاجت" ہے۔ مقصود اصل میں بقا ہے، زندگی ہے، حیات ہے۔ یہ ضروری اور واجب ہے۔ کوئی شخص مرنا نہیں چاہتا خواہ وہ کتنا ہی بیمار ہو یا تندرست ہو۔

انسان مدنی الطبع ہے یعنی اپنی بقا کے اسباب تنہا خود مہیا نہیں کر سکتا، جس طرح جانور اپنی زندگی کے کل اسباب مہیا کر لیتا ہے۔ اس کو کسی دوسرے جانور کی معاونت کی ضرورت نہیں۔ بر خلاف اس کے انسان میں تقسیم کار ہو گی کوئی ایک ضرورت پوری کرے گا۔ دوسرا، دوسری ضرورت مہیا کرے گا۔ تیسرا، تیسری ضرورت پوری کرے گا اور سب مل کر ایک دوسرے کی تمام ضرورتیں پوری کر دیتے ہیں۔

بقائے عالم کے تین اصل ہیں: عمارت، زراعت، خیاطت، [یعنی] رہائش، خوراک اور کپڑا۔ یہ مصالح عالم کہلاتے ہیں۔ رہنے کے لیے جگہ بنانا، کھانے وغیرہ کے لیے اناج وغیرہ پیدا کرنا اور پہننے کے لیے پوشاک تیار کرنا، یہ تین مصالح عالم ہیں۔ ان کے متعلقات، جیسے آہن گری، اینٹوں کی تیاری، سیمنٹ بنانا وغیرہ۔ یہ سب مصالح عالم میں شامل ہیں۔ اور جو کام ان مصالح عالم میں شامل نہیں ہیں ان ہی کو حرام کہتے ہیں۔ جو کام بقائے حیات میں دخیل نہیں ہے، وہی حرام ہے۔ کوئی کام ایسا کرنا پڑے گا جو فوراً یا کسی وقت آگے چل کر انسانی زندگی میں دخیل ہو، ایسے تمام کام جائز اور حلال ہیں۔ اور جن کاموں کو انسانی زندگی میں دخل نہیں ہے جیسے تصویر کشی، یہ نہیں کہا جائے گا یہ ناجائز ہے۔ یہ تین اصول اور اس کی بیسیوں فروع، یہ سب ایک شخص واحد نہیں کر سکتا۔ ہر کام الگ الگ اشخاص یا جماعتیں کریں گی۔ اب صورت یہ ہو گی کہ ایک شخص اپنے عمل کا تبادلہ دوسرے شخص کے عمل سے کرے گا۔ اب زراعت والا، اناج دے کر جولاہے سے کپڑا لے لے گا۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ کپڑے والے کو اناج کی ضرورت نہ ہو تو وہ تبادلے کے لیے تیار نہ ہو گا اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ ایک گز کپڑے کے لے پانچ سیر اناج کی طلب کرے تو کسان کی ضرورت پوری نہیں ہو گی تو اب ایک اور آدمی ہونا چاہیے جو اس تبادلہ کا نظام قائم کر دے کیونکہ یہ نظام قائم کرنا، نہ کسان کا کام ہے نہ جلاہے کا۔ یہ نظام قائم کرنے کے لیے کہ تبادلہ میں توازن قائم ہو اور اس متعین توازن پر عمل ہو اس کو دیکھنے کے لیے ایک تیسرے آدمی کی ضرورت ہے جو یہ نظام قائم کرے گا کہ ہر شخص اپنے عمل کو سکہ سے بدلے اسی کو سیم و زر بھی کہتے ہیں اور اس سکے سے ہر دوسرے شخص کے عمل کو بدل لے۔ اس عمل سے کاروبار پیدا ہو گا۔ اب ایسے کام میں جو تنازع ہوں گے، ان کا فیصلہ کرے گا اور جو ایسے عمل ہیں جو زندگی میں مفید نہیں ہیں، ان کو روکے گا۔ اب جو جماعت یا شخص اس کام کو کرے گا، اسی کا نام خلافت، امارت اور امامت ہے۔

اب ہم یہ کہتے ہیں کہ واجب نام ہے زندگی کا، حیات کا، بقا کا۔ اور زندگی کا قیام اس پر موقوف ہے کہ تنازع نہ ہو اور جو کام غیر مفید ہیں، وہ عمل مٹ جائے۔ تو انسانی زندگی ان دو چیزوں پر موقوف ہے۔ صحیح

عمل میں توازن اور بد عملی کا روکنا، تو اب اس کے لیے ایک آدمی چاہیے کہ ان دونوں معاملات میں درستگی کرا دے۔ اسی کا نام خلافت ہے۔ زندگی موقوف ہے ترک تنازع پر۔ تو ترک تنازعہ مقدمہ ہے زندگی کا۔ اور ترک تنازع موقوف ہے خلافت پر۔ تو خلافت مقدمہ ہوا زندگی کا اور زندگی واجب ہے۔ تو خلافت مقدمۂ واجب ہو گئی، کیونکہ اگر تنازع ترک نہ ہو گا تو زندگی نہ رہے گی۔

اب تقریر یوں ہو گی۔

خلافت مقدمۂ واجب ہے، اور مقدمۂ واجب، واجب ہے۔ لہٰذا خلافت واجب ہے۔ یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔ بڑا حسین بیان ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اجمل خان کے یہاں بیان کیا تھا، سب لوگ جھوم گئے۔

لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خلافت یا امامت واجب نہیں ہے وہ غلط کہتے ہیں، وہ بات نہیں سمجھے۔

اب دوسری شق یہ تھی کہ خلافت اللہ پر واجب ہے۔ اس کا رد اتنا حسین ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔

میں کہتا ہوں کہ خلافت اور امامت اللہ پر واجب نہیں ہے۔ خلافت فرع ہے نبوت کی کیونکہ خلیفہ رسول ہی کا تو نائب ہو گا۔ اور خود نبوت ہی اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں ہے تو خلافت کہاں واجب ہو گی؟ نبوت اور اس کی خلافت کا کیا مقصد ہے؟ اس کا مقصد تو خیر ہے۔ فلاح، فلاح مصالح کا حاصل کرنا، یہ ہے مقصد امامت اور خلافت کا۔ تمام علما، ائمہ، خلفا کا مقصد یہی ہے کہ شر نہ ہو، فساد نہ ہو، خیر ہو، صلاح و فلاح ہو۔ تو نبوت اور امامت خیر و فلاح کا ذریعہ ہے۔ خدا پر بقائے عالم واجب نہیں ہے ورنہ کبھی نہ مرتا۔ تو صلاح و فلاح جو مقدمہ ہے حیات کا خدا پر واجب کیسے ہو سکتا ہے؟ علاوہ اس کے خیر و شر دونوں اسی کی مخلوق ہیں اور اس عالم میں موجود ہیں تو خیر اس پر واجب نہ رہا کیونکہ اگر خیر واجب ہوتا تو اس کے خلاف شر کا وجود نہ ہوتا یہاں موت اور فساد دونوں موجود ہیں۔ اب جب کہ خیر اللہ پاک پر واجب نہیں ہے تو نبوت اور خلافت جو خیر کا ذریعہ ہیں اس پر واجب نہیں ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ پر خلافت اور امامت واجب نہیں ہے۔ خلافت و امامت تو کیا اللہ پر تو یہ عالم بھی واجب نہیں ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ازل سے ابد تک اس کو پیدا ہی نہ کرتا۔ اور ایک مدت تک جس کا کوئی اندازہ ہی نہیں اس کو پیدا نہ کیا۔ اگر اس کا پیدا کرنا واجب ہوتا تو ازل میں عالم ہوتا۔ مگر وہ بعد میں پیدا ہوا تو یہ اس پر واجب نہ رہا۔ جب عالم واجب نہ رہا تو اس کی بقا واجب نہ ہوئی اور جب بقا واجب نہ رہی تو اس کی صلاح و فلاح واجب نہ رہی۔ جب صلاح و فلاح واجب نہ رہی تو اس کا جو ذریعہ ہے خلافت وہ بھی اللہ تعالیٰ پر واجب نہ ہوئی۔

اللہ تعالیٰ پر کوئی شے واجب نہیں ہے۔ اس پر واجب کرنے والا کون ہے؟ عقل واجب کرے گی؟ عقل تو خود مخلوق ہے۔ وہ اپنے خالق پر کوئی شے کیسے واجب کر سکتی ہے؟ یا خود اللہ تعالیٰ اپنے اوپر واجب

کرے گا تو یا اضطراری طور پر کرے گا یا اختیاری طور پر کرے گا۔ اگر اضطراری طور پر کرے گا تو عالم قدیم ہو جائے گا اور اختیاری طور پر کرے گا تو اس کے خلاف نہیں کرے گا۔ تو نہ عالم قدیم ہے نہ ایسا ہے کہ خلاف نہ ہو رہا ہو۔ برابر دکھ، بیماری، فساد، موت سب ہو رہا ہے۔ تو اللہ پر کوئی شے واجب نہیں۔ قرآن میں جو «حقاً علینا» (یونس، ۱۰۳) فرمایا تو یہاں حق کے معنی واجب کے نہیں ہیں بلکہ عنایت و فضل کے ہیں۔ اس پر ہدایت بھی واجب نہیں ہے۔ اگر ہدایت واجب ہوتی تو شیطان کو پیدا نہ کرتا۔ اس کو پیدا کیا پھر اس کو قیامت تک کی مہلت دے دی کہ بہکا۔ اگر وہ چاہتا تو شیطان کو بھی ہدایت دے دیتا تو وہ بھی اسی طرح سجدہ میں گر پڑتا جس طرح اور ملائکہ گر پڑے۔ اس کی اس نے اللہ پاک سے شکایت بھی کی: «ربّ بمآ اغویتنی» (الحجر، ۳۹) ”اے رب میرے تو نے میرا اغوا کیا“۔ اللہ پر کوئی شے واجب نہیں ہے۔

اب دو باتیں غلط ہو گئیں کہ امامت واجب نہیں ہے اور امامت اللہ پر واجب ہے۔ اب تیسری بات کہ بندوں پر واجب ہے۔ تو عقلاً واجب ہے یا شرعاً واجب ہے۔ علماے معتزلہ جاحظ وغیرہ وہ تو کہتے ہیں کہ عقلاً واجب ہے کیونکہ ان کا تو سارا عقیدہ ہی عقلی ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات آپ اچھی طرح سمجھ لیں اور یہ بات میں نے ہی کہی ہے مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کہی کہ بقائے عالم یا انسان کی زندگی، یہ عقل پر موقوف نہیں ہے۔ اس لیے کہ کثیر تعداد جو تقریباً کلیت ہے، اور انسان کی تعداد ان کے سامنے ایسی ہے جیسے سمندر میں قطرہ، وہ کل حیوانات بغیر عقل کے زندگی گذار رہے ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا۔ عقل اس کو یہ زندگی گذارنے کے لیے نہیں ملی ہے۔ عقل کو اس حیات میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ اصولی غلطی ہے۔ «قل هل ننبّئکم بالاخسرین اعملا» (الکہف، ۱۰۳) ”کیا میں آگاہ کر دوں تم کو کہ کون ہے اعمال کے اعتبار سے گھاٹے میں“، «الّذین ضلّ سعیهم فی الحیوٰة الدّنیا» (الکہف، ۱۰۴) ”وہ ہیں جنہوں نے اپنی تمام زندگی کو دنیا کے حاصل کرنے میں برباد کر دیا“۔ دنیا کی زندگی حس پر موقوف ہے، عقل پر موقوف نہیں ہے۔ حس انسان اور جانور میں مشترک ہے۔ حیات کی بقا حس پر ہے، عقل پر نہیں ہے۔ اگر عقل کو اس زندگی میں دخل ہوتا تو تمام حیوانات کو بھی عقل دی جاتی مگر ان کو نہیں ملی۔ تو معلوم ہوا کہ عقل اس زندگی کے علاوہ کسی اور کام کے لیے ہے۔ اسباب حیات جتنے ہیں سب حس پر موقوف ہیں۔ خلافت کا تقرر تو اس کے لیے ہے کہ یہ حیات باقی رہے اور حیات کا باقی رہنا عقل پر موقوف نہیں ہے۔ اس لیے یہ عقل کا حکم نہیں ہے کہ خلافت قائم ہو۔ یہ ایک راز کی بات ہے کہ جو عمل موجودہ زندگی کی بقا کا ہے، کھانا پینا، سونا، کاروبار یہ اس زندگی کی بقا کے اسباب ہیں، بعینہٖ یہ عمل آخروی زندگی کی بقا کے ہیں: «إنّ صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰہ ربّ العٰلمین» (الانعام، ۱۶۲) ”میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری زندگی

کے جملہ اسباب رب العالمین کے لیے ہیں"۔ اگر یہ اعمال اپنی رائے سے ہو رہے ہیں تو اس حیات میں مفید ہیں۔ اگر یہ اس کی رائے سے ہو رہے ہیں، اس کے حکم کے مطابق ہو رہے ہیں تو حیات ابدی کے لیے ہو رہے ہیں۔ اپنی رائے سے جو اعمال ہوں گے وہ یہیں ختم ہو جائیں گے اور اس کے حکم کے مطابق جو عمل ہوں گے، وہ باقی رہیں گے اس کی دلیل یہ ہے کہ بھوک اور پیاس یہ داعی ہیں کھانے اور پینے کے عمل کے۔ تو جب تک بھوک رہے گی کھانے کا عمل ہوتا رہے گا۔ جب تک پیاس باقی رہے گی پینے کا عمل ہوتا رہے گا۔ اور بھوک پیاس کے ختم ہوتے ہی عمل ختم ہو جائے گا۔ یعنی عمل داعی کے ساتھ ہے، اگر داعی فانی ہے، عمل بھی فنا ہو جائے گا۔ اگر داعی باقی ہے تو عمل بھی باقی رہے گا۔ اگر کھانے پینے کے عمل خدا کے حکم سے ہیں یعنی اس کے حکم کے مطابق ہیں، تو یہ عمل باقی رہیں گے۔ «ما عندکم ینفد وما عندالله باقٍ» (النحل، ۹۶) "تمہارے پاس جو عمل ہیں وہ مٹنے والے ہیں اور اللہ کے پاس جو عمل ہیں وہ باقی رہنے والے ہیں"۔ اگر حیات اللہ کے حکم کے مطابق ہے تو ہمیشہ کی زندگی مل جائے گی۔

خلافت

عقل حاکم نہیں ہے، محکوم ہے۔ اگر بیٹا باپ سے کہے یہ کر، یہ نہ کر، تو برا معلوم ہو گا۔ ہاں باپ بیٹے کو حکم دے سکتا ہے اس کو کوئی برا نہیں کہے گا۔ تو باپ تو حاکم حقیقی نہیں ہے۔ حاکم حقیقی کو حکم عقل دے، یہ خیال ہی غلط ہے۔ پھر اگر عقل حاکم ہو گی تو حکم کس کو دے گی؟ اس کے نیچے کی جو چیزیں ہیں وہ ہیں: شہوت اور غضب۔ یہ دونوں بے عقل ہیں۔ ان سے خطاب نہیں ہو گا۔ مخاطب رب العالمین عقل ہی ہے۔ جب تک عقل رہے گی حکم باقی رہے گا کہ ان ماتحتوں سے اس طرح کام لے۔ عقل ختم ہوتے ہی تکلیف ختم ہو جائے گی۔ مجنون ہے، بچہ ہے، ان پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔ عقل محکوم ہے، حاکم نہیں ہے۔ یہ سخت غلطی ہے۔ یہ غلطی سب سے پہلے لعین اول سے ہوئی اور وہ ہی اپنے شاگردوں کو یہ سکھاتا ہے کہ عقل حاکم ہے۔ اس نے یہی تو جواب دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرنا عقل کے خلاف ہے۔ عقل تو کہتی ہے کہ گھٹیا چیز کو چاہیے کہ بڑھیا چیز کو سجدہ کرے اور تو نے حکم اُلٹا دے دیا۔ اس لیے میں نے سجدہ نہیں کیا۔ «أنا خيرٌ مّنه» (ص، ۷۶) سے اس کی یہی مراد تھی۔ یہ بڑی بے عقلی کی بات ہے کہ یہ لوگ عقل، عقل کہتے رہتے ہیں۔ عقل سے محکومیت کا کام لیا جائے گا، حاکمیت کا نہیں۔ اسے حاکم بنائیں گے تو سب نظام عالم ختم ہو جائے گا۔ نفس نام ہے شہوت اور غضب کے مجموعے کا۔ اگر نفس غالب آ گیا عقل پر تو عقل بے کار ہو گئی۔ ایک طرف عقل کو اتنا بڑھایا کہ اللہ پر حاکم بنا دیا۔ دوسری طرف اتنا گھٹایا کہ نفس سے نیچے گرا دیا۔ دونوں صورتیں تباہی کی ہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ اگر نفس کے تقاضے حکم الٰہی کے مطابق ہیں تو ان کو تقویت پہنچائے اور اگر حکم الٰہی

کے خلاف ہیں تو ان کو روکے۔ روزے میں بھوک پیاس لگے گی تو عقل روکے گی کہ روزہ میں کھانا پینا ممنوع ہے اور افطار کی حالت میں وہ اس کے مطابق کرے گی کہ اس کا اس کو حکم ہے کہ افطار کی حالت میں ان کی خواہش کے مطابق کرو۔ دونوں صورتوں میں اس کا حکم مانے گی۔ اسی کے حکم کے تابع رہے گی نفس کے تابع نہیں ہو گی۔ بلکہ چونکہ اس نے اجازت دے دی ہے اس لیے ان کے کہنے کے مطابق کرے گی۔ تو کوئی عمل ہو وہ حکم الٰہی کے مطابق، شرع کے مطابق ہو گا۔ عقل کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

امامت اور خلافت بھی ان اعمال میں سے ایک ہے۔ یہ بھی شرع کے مطابق قائم ہو گی۔ شرع نے حکم دیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بغیر خلافت کے ایک رات بھی نہ گزارو۔ یہی وجہ ہے کہ تدفین رسول میں دیر ہوئی۔ سب نے کہا کہ خلافت کا مسئلہ اہم ہے اس کو پہلے قائم کر لیں۔ حضور کا فرمان ہے، اس بنا پر خلافت واجب ہے۔ اگر فرمان نہ ہوتا تو یہ واجب نہ ہوتی۔ لہٰذا خلافت شرعاً واجب ہے۔ مثال سے اس کو سمجھ لیں۔ نماز واجب ہے اور نماز موقوف ہے طہارت پر، وضو پر۔ وضو مقدمہ ہے نماز کا۔ تو جس کے ذمہ نماز واجب ہے اسی کے ذمہ نماز کے جو موقوف علیہ ہیں ان کا مہیا کرنا ہے۔ جس کے ذمہ چھت کا بنانا ہے اسی کے ذمہ دیواروں کا بنانا ہے۔ پہلے دیواریں بنائے تب چھت بنے گی۔ نماز انسان پر واجب ہے تو ان چیزوں کا جن پر نماز موقوف ہے ان تمام اسباب کا مہیا کرنا بھی بندہ پر ہی انفرادی اور اجتماعی طور پر واجب ہے۔ خدا پر واجب نہیں ہے۔ ان سے کہہ دیا کہ تم ایسا کرو۔ تو اب یہ کہا جائے گا کہ بندوں پر واجب ہے، حکم الٰہی کے مطابق۔

امامت

تو خلافت بندوں پر واجب ہے شرعاً، عقلی نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں عقل کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ بغیر عقل کے زندگی گزار سکتا ہے۔ اگر شرع نہ ہو تو عقل بے کار ہے۔ تمام جانور زندگی کے پل پر سے ہلکے پھلکے گزر گئے اور یہ پہاڑ جیسا بوجھ عقل کا لاد کر گزرا۔ تو گزرنے میں تو دونوں برابر ہو گئے فرمایا کہ «إن هم إلّا كالأنعام بل هم أضلّ» (الفرقان، ۴۴) "یہ جانوروں کی طرح ہیں" کہ حیات کے پل پر سے وہ بھی گزر گئے، یہ بھی گزر گئے «بل هم أضلّ» "بلکہ ان سے بھی بدتر"، وہ یوں کہ وہ ہلکے پھلکے گزر گئے اور یہ بوجھ عقل کا لاد کر گزرا۔ زندگی مجنون اور بچہ دونوں گزارتے ہیں اگر طفلی کو طویل کر دیا جائے تو وہ گزارے گا یا نہیں؟ زندگی گزارنے کے لیے عقل کی قطعاً ضرورت نہیں ہے جو بھی حکم ہے وہ شرع سے ہے۔ عقل کا کوئی حکم نہیں ہے۔ بس عقل کا اتنا ہی کام ہے کہ حکم الٰہی کو سمجھے اور اعضا وغیرہ سے ان پر عمل کرائے اگر وہ ایسا نہیں کرے گی۔ تو یہ آنکھ کان ناک ہاتھ پیر زبان جتنے بھی اعضا ہیں سب اس کے خلاف گواہی دیں گے: «يوم تشهد عليهم ألسنتهم و أيديهم و أرجلهم بما كانوا يعملون» (النور، ۲۴)۔ جو ہمارے خلاف شہادت دے گا، وہ

چیز اچھی ہے یا بری؟ بہت بری چیز ہے۔ یہ اعضا ہمارے دشمن ہیں ہمارے خلاف شہادت دیں گے۔ ان کے مقتضا اور مذاق کے مطابق کبھی عمل نہیں کرنا چاہیے۔ جب انسان ان سے پوچھے گا یہ کیا؟ تو کہیں گے کہ ہم کیا کریں اللہ نے ہم کو زبان دے دی اور حکم دیا کہ بولو ہم بولنے لگے تمہارے خلاف۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ مر جائے گا اور یہ ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، زبان، یہ گڑھے میں ڈال دیے جائیں گے، کچھ ساتھ نہیں دیں گے۔ تو یہ کتنا بڑا دھوکا ہے کہ جو شے ساتھ نہ دے اور خلاف شہادت دے اس کے کہنے پر عمل کرتا رہے۔ ارے ان سے اپنے مطابق عمل کرا۔ یہ تو گدھا ہے۔ اس سے کام لے اور ضرورت کے مطابق چارہ دے دے، ورنہ کچھ ضرورت نہیں ہے۔ انسان کو بڑا سخت دھوکا لگا ہے اور چونکہ یہ فطری ہے اس لیے اس سے نکلتا نہیں ہے۔ نبی کا کچھ کام نہیں صرف یہی بتانے کے لیے آیا ہے کہ اس دنیا کے دھوکے میں نہ آنا «فلا تغرّنّکم الحیوٰۃ الدّنیا» (لقمان، ۳۳) ''اس کمینی زندگی کے دھوکے میں نہ آنا''۔ یہ بہت بڑا فریب ہے۔ اب میں کیسی باریک باتیں بیان کر رہا ہوں۔ ہزار برس کا عالم بیان نہیں کر سکتا، اور دو منٹ میں کچھ نہیں۔ کہاں گئیں وہ باتیں، وہ فکریں؟ سب ختم۔ ایسی باریک باتیں بیان کرنے والے سب گئے زیر زمین۔ کہاں ہیں وہ؟ اسی طرح میں بھی چلا جاؤں گا۔ تو یہ فریب ہی ہوا ناں؟ اب یہ فریب کیا ہے؟ اسے بھی سمجھ لیں۔

یہ جو حیات ہے، اس کی بقا موقوف ہے حس و حرکت پر۔ حرکت ایسی کمزور شے ہے، اس کے اجزا مجتمع نہیں ہیں۔ ایک جز مٹتا ہے تو دوسرا جز پیدا ہوتا ہے جیسے قدم ایک ختم ہوتا ہے، تب دوسرا اُٹھتا ہے۔ اور حس کا یہ حال ہے کہ سب کو محسوس کرتی ہے، اپنے آپ کو محسوس نہیں کرتی۔ آج تک اس نے اپنے آپ کو نہیں جانا۔ تو جو اپنے آپ کو نہیں جانتی وہ یہ دعوٰی کرے کہ میں سب کو جانتی ہوں، کس قدر عظیم الشان دھوکا ہے۔ جو خود اپنے آپ کو نہ جانے دوسرے کو کیا خاک جانے گی؟ اور حیات حس و حرکت کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور ان دونوں کا خدا خالق ہے۔ تو خالق میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہوں گی۔ اور ان کے نہ ہوتے ہوئے بھی وہ حی ہے۔ تو حقیقی حیات تو وہ ہے جو اسے حاصل ہے۔ یہ دو منٹ میں ختم ہو جاتی ہے۔ اصلی حیات تو وہ ہے جو مجھے حاصل ہے «بل أحیآءٌ عند ربّھم» (آل عمران، ۱۶۹) ''شہدا اپنے رب کے پاس ہیں''، «بل أحیآءٌ» وہ بظاہر کٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ''حقیقت میں زندگی ان کو حاصل ہے''، «و لکن لاتشعرون» (البقرۃ، ۱۵۴) اور وہ زندگی ایسی ہے کہ ''تم کو اس کا شعور نہیں ہے''۔ ان کو ویسی ہی زندگی حاصل ہے جیسی کہ اس کی ہے جس کے پاس وہ ہیں۔ اس زندگی کا تم کو شعور نہیں ہے۔

شعور میں نہ آنے کی وجہ بھی مثال سے سمجھ لیں۔ ایک شخص نوم غریق میں دیکھ رہا ہے کہ وہ نہایت خوش نما جگہ پر ایک مجلس میں بیٹھا ہے۔ اور بات چیت لوگوں سے کر رہا ہے۔ اس وقت کسی نے اس کو جگا دیا تو وہ اس مجلس سے مر گیا۔ تو اب جو لوگ اس مجلس کے ہیں وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ کیسی زندگی میں آ گیا۔

وہ تو یہی سمجھیں گے کہ وہ مر گیا۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ وہ ایسی زندگی میں آگیا جس کا ان کو شعور نہیں۔ اس لیے فرمایا «ولکن لا تشعرون» "تم کو اس زندگی کا شعور نہیں ہے"۔ اصلی زندگی کو بھول گیا اور اس زندگی کے دھوکے میں آگیا۔ اور اس کی فکر میں مشغول ہو گیا۔ بس یہی تباہی کا سبب بن گیا۔

امامت کے مسئلہ میں کس قدر عظیم الشان دھوکا کھایا ہے۔ قوانین عقل کو استعمال نہیں کیا اور جو جی چاہا اناپ شناپ کہہ دیا کہ امام کو معصوم ہونا چاہیے وہ تنفیذِ احکامِ ربانی کرے گا۔ وہ صرف انتظام عالم کو درست رکھے گا۔ بس یہ ہے کام امام اور خلیفہ کا۔ «ولقد کتبنا فی الزّبور من بعد الذکر أنّ الأرض یرثها عبادی الصٰلحون» (الانبیاء، ۱۰۵) "ہم نے ذکر و نصائح کے بیان کے بعد زبور میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ زمین میرے صالح بندوں کے ورثہ میں آئے گی"۔ صلاحیت والے بندے جن میں فساد کو روکنے اور مصالح کو قائم کرنے کی صلاحیت ہو گی، ان کے ورثے میں یہ زمین آئے گی۔ تو امام کا کام یہ ہے کہ فساد اور خون ریزی نہ ہونے دے اور عمل و معاملات کو درست رکھے۔ کوئی قید نیک و بد کی نہیں ہے۔ ایک شخص نہایت نیک ہے، عابد ہے، زاہد ہے، ولی کامل ہے، عالم فاضل ہے، لیکن انتظامی قابلیت نہیں ہے، وہ خلیفہ نہیں بنے گا۔ ایک شخص میں انتظامی قابلیت ہے اور یہ خوبیاں نہیں ہیں وہ خلیفہ بن جائے گا۔ امام شافعیؒ کو آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کتنے بڑے عالم تھے؟ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے اور ان کے علم کا ایک ٹکڑا کسی کو حاصل ہو جائے تو بڑا جید عالم فاضل ہو جائے گا۔ مگر انتظامی قابلیت ان میں نہیں تھی۔ ہارون الرشید میں تھی۔ یہ فن الگ ہے۔ وہ فن الگ ہے۔ اسی لیے فرمایا: «إنّ فی هٰذا لبلٰغاً لقومٍ عٰبدین» (الانبیاء، ۱۰۶)، کان کھول کر سن لیں وہ اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ وہ نیک ہیں تو وہ خلیفہ ہوں گے۔ خلیفہ وہ ہو گا جس میں انتظامی قابلیت ہو گی۔ پھر آگے فرمایا: «و مآ أرسلنٰک إلّا رحمةً للعٰلمین» (الانبیاء، ۱۰۷) "آپ کو ہم نے سب کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔ خواہ عابد ہوں، خواہ منتظم، عابدوں کو عبادت کرنا سکھائیے، منتظموں کو انتظام کرنا سکھائیے۔ کتنا مرتب کلام ہے۔ اب اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔

امامت

جو چیز عقل و شرع کے خلاف ہو، لغت کے خلاف ہو، اجماع کے خلاف ہو، اجماع عالم کے خلاف ہو وہ ناقابل سماعت ہے۔ خدا کے قول کے خلاف، رسول کے قول کے خلاف، اجماع کے خلاف، لغت کے خلاف، وہ کچھ نہیں۔ حضرت علی کے لیے کرم اللہ وجہہ ہے۔ ہمارے یہاں جب خارجیوں نے کہا سوء وجہک تو اس کے جواب میں یہ سنیوں نے کہا۔ شیعہ اولیٰ صحابہ میں سے تھے اور سنی تھے تو پہلا شیعہ سنی تھا۔ وہ اصحاب رسول اللہ تھے جو ان کی خلافت کو برحق مانتے تھے۔ انہوں نے ان کو خارجیوں کے مقابلہ

میں لقب دیا کرم اللہ وجہہ۔ چونکہ علیہ السلام انبیا کے لیے آتا ہے۔ اس لفظ سے شبہ پیدا ہوتا ہے اس لیے وہ تنہا نہیں بولتے۔ لیکن جب نبی کے ساتھ آئیں گے تو سب کے لیے سلام آئے گا جیسے درود شریف میں اہل بیت تو سلام آئے گا اور تنہا آئیں گے تو وہی رضی اللہ عنہ کہا جائے گا۔ افضلیت کا قصہ نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کی نہ افضلیت ثابت ہے، نہ اولیت ثابت ہے یعنی خلافت اولیٰ ثابت نہیں ہے۔ نہ حضرت علیؓ کی نبی کے بعد افضلیت ثابت ہوتی ہے اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو افضل ہو وہ خلیفہ ہو۔

ان کی دلیل کے دو مقدمہ ہیں:

(۱) افضل خلیفہ ہے اور (۲)حضرت علیؓ افضل ہیں۔ اس لیے حضرت علیؓ خلیفہ ہیں یہ دلیل ہے ان کی۔ مگر دونوں مقدمے جو انہوں نے قائم کئے ہیں، دونوں غلط ہیں۔ اس لیے حضرت علی افضل ہیں تو افضلیت کی معیار کیا ہے؟ جو معیار آپ مقرر کریں گے وہ درحقیقت ثابت ہی نہیں ہو گا۔ ایک افضلیت ہے۔ ان کی فضیلت میں کوئی شبہ نہیں، افضلیت میں شبہ ہے۔ جتنی فضیلتیں اور کمالات ہیں سب منطبق کریں۔

(۱)۔ اگر علم موجب افضلیت ہوتا، تو حضرت خضرؑ حضرت موسیٰؑ سے افضل ہو جاتے۔ حضرت موسیٰ نے بڑی لجاجت اور عاجزی سے انہوں نے کہا کہ جو رشد و ہدایت اور علم تجھے حاصل ہے میں تیری پیروی اور شاگردی کروں گا اگر تو مجھے عنایت کرے «قال لهٗ موسىٰ هل أتّبعک علىٰٓ أن تعلّمن ممّا علّمت رشداً» (الکہف،٦٦)، تو خضر کو موسیٰؑ سے زیادہ علم تھا اور ان سے وہ قطعی افضل نہیں تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: «يٰموسىٰٓ إنّي اصطفيتک علىٰ النّاس»(الاعراف، ۱۴۴)، "اے موسیٰؑ ہم نے تم کو تمام آدمیوں پر مصطفیٰ کیا تو موسیٰ حضرت خضر پر مصطفیٰ ہو گئے۔ تو موسیٰ علم میں کمتر تھے، مگر افضل تھے حضرت خضر سے۔ اول تو یہ معلوم نہیں کہ علم حضرت علیؓ میں زیادہ تھا یا نہیں؟ لیکن ہم ان کمالات کو تسلیم کر لیتے ہیں، پھر دیکھتے ہیں۔

(۲)۔ اگر روحانیت موجب افضلیت ہوتی تو عیسیٰؑ تمام نبیوں سے افضل ہوتے، کیونکہ ان میں روحانیت زیادہ تھی۔ وہ نیم مادی تھے۔ باقی نبی ماں باپ سے پیدا ہوئے ان میں پوری مادیت تھی، یہ روح اللہ تھے۔ مگر وہ موسیٰ سے بھی افضل نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ نبی آخر الزماں سے۔ نہ ہمارے نزدیک، نہ ان کے نزدیک۔ دونوں ان کو افضل نہیں مانتے۔

(۳)۔ اب سبقت اسلام لے لیجئے۔ اگر سابقیت اسلام موجب افضلیت ہوتی تو تمام انبیا سابقین حضور اکرم ﷺ سے افضل ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تو سابقیت اسلام بھی موجب افضلیت نہیں رہی۔

(۴)۔ اگر زہد و تقویٰ اور عبادت موجب افضلیت ہو تو بہت سے انبیا ہیں جنہوں نے نو نو سو برس عبادت کی ہے۔ ان کو افضل ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ بھی حضور سے افضل نہیں ہیں۔ حالانکہ آپ کی کل عمر ٦٣ سال

کی ہوئی۔ انہوں نے بھی خدا کی خوشنودی کے لیے تبلیغ کی۔ انہوں نے کل ۲۳/ سال کی، اُنہوں نے صدہا سال کی۔ جو معیار آپ مقرر کریں گے افضلیت کی، وہ ٹوٹ جائے گا، ان کی مثل یا اس سے اعلیٰ موجود ہو گا۔

(۵)۔ اب رہی نسبت، تعلق اور قرابت۔ اگر یہ موجب افضلیت ہو تو قرابت حضرت فاطمہؓ سے زیادہ تھی۔ وہ اقرب تھیں۔ نسب کے اعتبار سے حضرت فاطمہؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت حسنؓ یہ زیادہ قریب تھے۔ اگر قربت موجب افضلیت ہو تو ان تینوں کو افضل ہونا چاہیے۔

(۶)۔ اگر دامادی رشتہ موجب افضلیت ہو تو حضرت عثمان غنیؓ ڈبل داماد تھے۔

(۷)۔ اگر جہاد موجب افضلیت ہو تو حضوراکرم ﷺ نے اتنا جہاد نہیں کیا جتنا حضرت علیؓ نے کیا، تو چاہیے کہ حضرت علی حضور اکرم ﷺ سے بھی افضل ہو جائیں۔

(۸)۔ اگر شہادت کا قوی ہونا موجب افضلیت ہو گا تو حضرت خذیمہؓ کو افضل ہونا چاہیے کہ ان کی ایک شہادت دو شہادتوں کے برابر ہے۔ کسی یہودی نے آپ پر قرض کا تقاضا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے ادا کر دیا۔ اس نے کہا کہ گواہ لاؤ حضرت خذیمہؓ نے کہا میں شہادت دیتا ہوں۔ جب ان سے دریافت کیا کہ تم اس محفل میں نہ تھے تم نے شہادت کیسے دے دی؟ جواب دیا کہ آپؐ روز کہتے ہیں کہ آج آسمان سے یہ خبر آئی، یہ خبر آئی، ہم سب کی تصدیق کرتے ہیں۔ تو جب آپؐ نے کہا کہ آپؐ نے ادا کر دیے، میں نے اس کی بھی تصدیق کر دی کہ ہاں دے دیے۔ آپؐ نے فرمایا ان کی ڈبل شہادت۔

(۹)۔ اگر یہ کہو کہ اللہ نے ان پر فضل اور مہربانی کی ہے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ حضرت زید کو ڈبل انعام ملا «إذ تقول للّذیٓ أنعم اللّٰہ علیه و أنعمت علیه» (الاحزاب، ۳۷) اور ”جب تو کہہ رہا تھا اس شخص سے جس پر انعام کیا اللہ نے اور تو نے انعام کیا“۔ حضرت زیدؓ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ مگر باوجود ڈبل انعام کے دونوں فریقوں کے نزدیک وہ افضل حضرات شیخینؓ سے نہیں ہیں۔ غرض جو معیار افضلیت کی مقرر کریں گے وہ قائم نہیں ہوں گے۔ ہاں فضیلت ضرور ہے، افضل نہیں ہیں۔

آج آپ کا سبق تو رہ گیا، مگر قانون آپ کو بتلا دوں۔ ضابطہ سن لیں بڑی اچھی بات ہے۔ فضیلت کی دو قسمیں ہیں: ایک بلا کسب و عمل فضیلت ہوتی ہے اور دوسری کسب و عمل سے حاصل ہوتی ہے جیسے جمعہ باقی دنوں سے افضل ہے۔ اور رمضان کا مہینہ باقی مہینوں سے افضل ہے۔ کعبے کی عمارت کو باقی عمارتوں پر بلا کسب و عمل فضیلت ہے۔ اور دوسری فضیلت ہے کسب و عمل پر۔ یہاں گفتگو اس فضیلت پر ہو رہی ہے جو کسب و عمل پر موقوف ہے، ذاتی فضیلت پر یہاں بحث نہیں ہو رہی ہے۔ حضرت فاطمہؓ ذاتی فضیلت میں سب سے اعلیٰ ہیں۔ ان سے اعلیٰ کوئی نہیں، نہ مرد نہ عورت۔ یعنی حضور ﷺ ابن عبداللہ ہیں۔ اور حضرت فاطمہؓ بنت محمد ﷺ ہیں۔ جو نسب ان کو حاصل ہے وہ نہ کسی نبی کو حاصل ہے نہ کسی ولی کو حاصل ہے، کوئی عمل نہیں کیا۔ یہ

فضیلت بغیر عمل کے حاصل ہے۔ اگر دنیا سے ذرا سا بھی ہٹے تو یہ علم کوئی چیز نہیں، جو صحیح علم ہے وہ حاصل ہو جائے۔ یہ رعب جو ڈال رہا ہے۔ «فلا تغرّنّکم الحیٰوة الدّنیا» (لقمان، ۳۳) ”دنیا کی زندگی تم کو دھوکے میں نہ ڈال دے“۔ چوبیس گھنٹے دنیا میں مصروف، آپ سے زیادہ میں مصروف۔ ذرا بھی دنیا سے ہٹے تو دروازہ عمل کا کھل جائے گا۔ عجائب و غرائب کا انکشاف ہو گا۔ میں نے یہ سب چیزیں نہ سیکھی ہیں نہ پڑھی ہیں۔

اب عمل کی فضیلت کے لیے ضابطہ چاہیے۔ اس کا ضابطہ اللہ نے مقرر کر دیا: «لا یستوی منکم مّن أنفق من قبل الفتح و قٰتل» (الحدید، ۱۰)، ”کعبے کے فتح ہونے سے قبل جس نے خرچ کیا اور جہاد کیا ان کے برابر کوئی نہیں“، «أولٰئک أعظم درجةً مّن الّذین أنفقوا من بعد و قٰتلوا» (الحدید، ۱۰)، ”بعد میں جن لوگوں نے خرچ کیا اور جہاد کیا ان لوگوں سے یہ اعظم درجے کے ہیں“۔ کلیہ ضابطہ بتا دیا۔ بڑی اچھی دلیل ہے۔ دلیل وہی اچھی ہے جو خدا بتا دے۔ ہم بہت سی عجیب و غریب باتیں نکالتے ہیں، سب میں شک رہتا ہے کہ خدا نے منظور بھی کیا یا نہیں؟

اب یہاں دو چیزیں ہیں: انفق اور قاتل۔ انفق مقدم ہے قاتل پر، اس لیے انفق قاتل سے افضل ہے۔ حضرت ابو بکرؓ منفق ہیں۔ تو حضرت علیؓ کا جہاد بھی ثابت ہو جائے، تو وہ منفق نہیں ہیں۔ اس لیے افضلیت حضرت ابو بکرؓ کو ہے۔ قرآن کا ضابطہ تو یہی ہے، اور یہ حق ہے۔ بڑی اچھی دلیل ہے اور بہت واضح ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دل کو نہ لگے۔ اکثر ہوتا ہے کہ کوئی تکلیف ہو گئی، معدہ میں بیماری ہو گئی، تو اچھی سے اچھی غذا بھی اچھی نہیں لگتی، بری معلوم ہوتی ہے۔ ہمارا کام بس اتنا ہی ہے کہ اچھی غذا پیش کر دیں۔ باقی کام اللہ کا ہے، جب وہ چاہے گا قبول کر لے گا۔ اور ہدایت نبی بھی نہیں کر سکتا، ہدایت خدا ہی کرتا ہے۔ اگر خدا نہ چاہے تو نبی لاکھ کوشش کرے، کبھی ہدایت نہیں دے سکتا۔ «إنّک لا تهدی من أحببت»، ”جس کو تو چاہتا ہے ہدایت نہیں دے سکتا“، «و لکنّ اللّٰه یهدی من یّشآء» (القصص، ۵۶)، ”اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے“۔ تیرا کام صرف تبلیغ کرنا اور ہدایت پہنچا دینا ہے بس۔ بدعتِ عمل تو کوئی چیز ایسی نہیں ہے، عقیدہ میں بدعت ہونا، یہ خطرناک ہے۔ مسلمانوں میں جو فرقے بنے ہیں عمل میں نہیں بنے، عقیدہ میں بنے ہیں۔

تو اگر افضل ثابت ہو بھی جائیں تو مستحق خلافت نہیں ہیں۔ «إذ قالوا لنبیٍ لّهم إبعث لنا ملکاً نقٰتل فی سبیل اللّٰه» (البقرة، ۲۴۶)، ”جب بنی اسرائیل نے اس زمانے کے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے بادشاہ مقرر کرو تاکہ ہم جہاد کریں راہ خدا میں“ تو اللہ نے طالوت کو مقرر کر دیا۔ «و قتل داؤد جالوت» (البقرة، ۲۵۱) ”اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا“۔ ایک نبی یہ موجود، دوسرا وہ نبی جس سے بنی اسرائیل نے کہا۔ تو نبیوں کی موجودگی میں طالوت خلیفہ ہو گیا۔ حالانکہ طالوت دونوں نبیوں سے قطعی افضل نہیں تھے بلکہ کم

تر تھے، بالاتفاق۔ اگر وہ نبی نہیں تھے تو گھٹیا ہوئے، اور اگر نبی تھے تو قطعیت سے ثابت نہیں مشکوک نبی تھے۔ پھر بھی قطعی نبی کے مقابلے میں گھٹیا رہے۔ تو افضل کی موجودگی میں گھٹیا خلیفہ ہو گیا۔ تو معلوم ہوا کہ خلافت افضلیت کو لازم نہیں ہے۔ افضلیت کی ضرورت نہیں، غیر افضل خلیفہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا ضابطہ: افضلکم اتقاکم، "افضل وہ ہے جو اتقیٰ ہو"۔ اتقیٰ کون ہے؟ «لایصلٰھآ إلّا الأشقیٰ ۰ الّذی کذّب و تولّٰی ۰ و سیجنّبھا الأتقٰی ۰ الّذی یؤتی مالہٗ یتزکّٰی» (اللیل، ۱۵ تا ۱۸) بچائے گا دہکتی ہوئی آگ سے اتقیٰ کو۔ اتقیٰ وہ ہے جو اپنے مال کو پاک کرنے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ اب اتقیٰ سنیوں کے نزدیک حضرت ابو بکرؓ اور شیعوں کے نزدیک حضرت علیؓ ہیں۔ «و ما لأحدٍ عندہٗ من نعمةٍ تجزیٰٓ» (اللیل، ۱۹)، "اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں ہے جس احسان کے بدلے میں یہ روپیہ خرچ کرتا ہو"۔ ساری دنیا پر رسول ﷺ کی ہدایت کا احسان ہے۔ لیکن یہ ایسا احسان ہے جو ناقابل پلٹ ہے۔ «مآ أسئلکم علیه من أجرٍ» (الفرقان، ۵۷)، "میں اس کا بدلہ تم سے نہیں چاہتا"۔ تو آپ کے احسان کا بدلہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اب رہ گیا مالی بدلہ تو حضرت ابو بکرؓ کا حضور انور ﷺ پر ہے۔ حضرت ابو بکرؓ پر کسی کا مالی احسان نہیں ہے۔ مگر حضرت علیؓ پر حضور کا مالی احسان ہے۔ ان کو پالا، پرورش کیا، تربیت دی۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں اتقیٰ سے مراد علیؓ نہیں ہو سکتے، حضرت ابو بکرؓ ہیں۔ افضل جو ہے اتقیٰ ہے اور اتقیٰ ابو بکرؓ ہیں۔ لہٰذا افضل ابو بکرؓ ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ پر کسی نے احسان کیا ہو، اس کے بدلے میں وہ روپیہ دیں یہ ہرگز نہیں ہے۔ «إلّا ابتغآء وجه ربّه الأعلٰی» (اللیل، ۲۰)، "اپنے رب کی ذات کو خوش کرنے کے لیے وہ ایسا کرتے ہیں"۔ حضرت علیؓ پر حضور کا احسان ہے اور حضرت ابو بکرؓ پر حضور کا مالی احسان نہیں ہے، ہدایتی احسان ہے۔ اور ہدایتی احسان اس قابل نہیں کہ اس کا بدلہ کیا جائے۔ دوسری جگہ ہے کہ «و لا یأتل أولوا الفضل منکم والسّعة أن یؤتوآ أولی القربیٰ و المسٰکین و المھٰجرین فی سبیل اللہ» (النور، ۲۲) قسم کھائی بعد فضل کے، ایک تو ذی فضل ہے اور ایک اولیٰ۔ افضل جمع کا لفظ بولا بڑے ادب سے۔ جب ان کی بیٹی پر تہمت لگائی تو انہوں نے قسم کھائی کہ میں ان کو نہیں دوں گا۔ ظاہر ہے حضرت علیؓ نہیں ہو سکتے، ان کی بیٹی کا سوال ہی نہیں۔ پہلے ان کو دیا کرتے تھے اب قسم کھا لی کہ نہیں دوں گا۔ ہر طریقے سے جہاں عملی فضیلت کا سوال ہے، حضرت ابو بکرؓ ہی افضل ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے بارے میں جو آیت نازل ہوئی وہ معجزۂ قرآن ہے۔ کیونکہ اگر خود نبی کا کلام ہوتا تو ان کو اس آیت سے کبھی اطمینان نہ ہوتا۔ جب اس آیت سے ان کی طبیعت مطمئن ہو گئی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ صداقت باہر سے آئی ہے۔ جب باہر سے آئی تو من جانب اللہ ہوئی اور جب من جانب اللہ ہوئی، تب ہی آپؐ کے دل کو اطمینان ہوا۔ حضور ﷺ کا اطمینان دلیل ہے اس آیت کے من جانب اللہ ہونے پر۔ تو حضرت عائشہؓ کی شہادت سے معجزہ ثابت ہوا۔ اب یہاں سوال پیدا

ہوتا ہے کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں؟ «لآ أسئلکم علیه أجراً إلّا المودّة فی القربیٰ» (الشوریٰ، ۲۳)، اس کے تین مفہوم ہو سکتے ہیں۔ میں تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا الا یہ کہ

(۱) قرابت داری کی بنا پر مجھ سے محبت کرو، میں تمہارا قریب ہوں۔

(۲) یا میری قرابت داری کی بنا پر میرے قرابت داروں سے محبت کرو۔

(۳) یا تم اپنے قرابت سے اپنی قرابت کی وجہ سے محبت کرو ان سے بھلائی کرو۔

یہ استثنا منقطع ہے۔ لیکن معنی میں میری دلیل ہے اور بالکل نئی ہے، جو اللہ نے مجھ پر منکشف کی۔

دلیل: خرچ کرنے میں بقا ہے، قتل کرنے میں فنا ہے۔ بقا فنا سے افضل ہے۔ اس لیے خرچ کرنا جنگ کرنے سے افضل ہے۔

حضرت ابو بکرؓ حضور ﷺ سے اتنے کمتر ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ سے اتنا کمتر کوئی نہیں۔ قیامت تک کا کوئی مسلمان حضرت ابو بکرؓ سے اتنا گھٹیا نہیں، جتنے وہ حضور ﷺ سے ہیں۔ کیونکہ غیر نبی، غیر نبی سے کتنا بھی گھٹیا ہو کوئی نہ کوئی نسبت اس کی ضرور قائم ہو گی۔ مگر نبی سے غیر نبی میں گھٹیا پن کی کوئی نسبت ہی نہیں، وہ لائن ہی الگ ہے۔ یعنی کوئی غیر نبی ترقی کرتے کرتے گھٹیا درجے کا بھی نبی نہیں بن سکتا۔ لیکن ایک معمولی مسلمان ترقی کرتے کرتے نہ پہنچے وہ اور بات ہے، مگر صدیقیت تک پہنچنے کا امکان ضرور ہے۔ غیر نبی کا بلند ترین درجہ صدیقیت ہے اور اس کے بلند ترین نقطہ پر حضرت ابو بکرؓ ہیں۔ لیکن نبی اس لائن میں نہیں ہے۔ نبی کی لائن ہی الگ ہے۔ نبی اور غیر نبی میں نسبت قائم نہیں ہو سکتی۔ مگر اس قدر افضل ہونے کے باوجود حضرت ابو بکرؓ کو آپ نے امام بنا دیا۔ اور اتنے بڑے افضل نے ابو بکرؓ کے پیچھے نماز پڑھ لی۔ تو ایک معمولی ولی کسی فاسق کے پیچھے نماز پڑھ لے تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

تو امامت صغریٰ میں بھی یہی ضابطہ جاری ہے۔ افضلیت کی ضرورت نہیں۔

دلیل: نبی مخاطب رب العالمین ہے، صدیق مخاطب رسول۔ صدیقین اور مومنین، سب نبی کی آواز پر جا رہے ہیں، خدا تک نہیں جا رہے نبی تک جا رہے ہیں۔ اور نبی کے پاس خود خدا آ رہا ہے۔ خدا ”یا“ کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ جو نبی تک پہنچ جائے گا نبی فوراً اس کو خدا تک ملا دے گا۔ براہ راست خدا تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ صدیقیت بڑھتے بڑھتے چھوٹے نبی تک پہنچ جائے یہ ممکن نہیں ہے۔ ممکن کی لائن صدیقیت پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہاں نسبت قائم ہو سکتی ہے کیونکہ یہ لائن ممکن کی ہے، محدود ہے۔ اور نبی کی لائن ممکن سے باہر ہے، غیر محدود ہے، اس لیے وہاں نسبت قائم نہیں ہو گی۔ اگر کسی شخص نے حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور قعدہ کے اندر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی حضور ﷺ نے سلام پھیر دیا۔ تو ایک منٹ کی اقتدا کی فضیلت اتنی بڑی ہے کہ حضرت صدیقؓ کے پیچھے ساری عمر نماز ادا کرتا رہے، تب

بھی اس کے برابر نہیں ہو گی۔

سوال: حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کو روک دیا جب آپ نے کاغذ قلم منگوایا؟

جواب: پہلے تمہید سمجھ لیں بہت نازک بات ہے۔ اس کو نہ سنی سمجھے نہ شیعہ، دونوں نہیں سمجھے۔ دو چیزیں ہیں شریعت اور نبوت۔ ان میں شریعت قابل نسخ ہے، نبوت قابل نسخ نہیں ہے۔ شریعتیں اکثر معزول ہو گئیں ہیں۔ نبی کبھی معزول نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ہمارے بعض شرائع منسوخ ہو گئے، پچھلی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ مگر انبیا کو باقی رکھا، کوئی منسوخ نہیں ہوا۔ لہٰذا نبوت، شریعت سے افضل ہے۔ فاعل فعل سے، قائل قول سے، شارع شریعت سے مقدم ہے۔ اگر دونوں میں ٹکراؤ ہو کہ ایک کو لیں تو دوسرا چھوٹے، تو اس وقت کیا کرنا چاہیے؟ اس وقت مقدم اور افضل کو اختیار کیا جائے گا، اور مؤخر اور کم تر کو چھوڑ دیا جائے۔ عقل بھی یہی بتاتی ہے۔ تو ضابطہ یہ ہے کہ اعلیٰ کو اختیار کر لے اور ادنیٰ کو چھوڑ دے۔ سو اور دس کا نوٹ گر جائے پانی میں تو سو کا اٹھالیں گے اور دس کا ڈوب جائے تو کوئی حرج نہیں۔ بچہ اور کتا ساتھ ہیں گولی آئی تو کتا مر جائے، بچہ بچ جائے تو یہ بہتر ہے۔ شریعت کو چھوڑنے کا لفظ بہت سخت ہے، بہت نازک مرحلہ ہے۔

بہر حال اب اصل معاملہ پر آئیں۔ حضور انور ﷺ کی طبیعت اس وقت پریشان تھی، اور حضور ﷺ اس وقت جو کچھ لکھواتے وہ شریعت ہوتی۔ خواہ وہ وہی لکھواتے جو شیعہ حضرات کہتے ہیں۔ کیا لکھواتے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ مگر جو کچھ لکھواتے شریعت ہوتی۔ تو شارع کو تکلیف اور پریشانی نہ ہو، اس لیے شریعت کو چھوڑ دیا مثلاً سچ بولنا شریعت ہے مگر نبی کو سچ بول کر دشمنوں کے ہاتھ پکڑوا دینا، یہ کفر ہے۔ اس وقت جھوٹ بول کر دشمنوں سے نبی کی جان بچا لینا، فرض اور عین ایمان ہے۔ سامنے سے تیر آتا ہو، گند گی آتی ہو نبی پر، اس وقت نبی کے سامنے آ جانا فرض ہے۔ حالانکہ شریعت یہ ہے کہ «لا تقدّموا بین یدی اللہ و رسولہٖ» (الحجرات، ۱)، ”رسول سے آگے نہ بڑھو“، «لا ترفعوآ أصوٰتکم فوق صوت النّبیّ» (الحجرات، ۲)، ”اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو“ یہ شریعت ہے۔ مگر دشمنوں سے بچانے کے لیے اتنا شور کرنا چاہیے کہ نبی کی آواز دب جائے اور دشمن نبی کی آواز نہ پہچان سکیں۔ یہ فرض ہے، یعنی شریعت کو چھوڑنا پڑے گا، جھوٹ بولنا پڑے گا، نبی کے سامنے آنا پڑے گا، اور آواز کو نبی کی آواز سے بلند کرنا پڑے گا۔ ایسے مواقع پر یہی عین ایمان ہے، صدیقیت کا درجہ رکھتی ہے۔

دلیل: صلح حدیبیہ کے وقت لکھا گیا محمد رسول اللہ ﷺ۔ تو کفار نے اعتراض کیا کہ یہ محو کر دو، سارا جھگڑا تو اسی بات پر ہے۔ اگر ہم تم کو رسول اللہ مان لیں تو پھر کوئی جھگڑا ہمارے تمہارے درمیان نہیں رہتا۔

ابن عبد اللہ لکھو۔ حضور نے حکم دیا مٹادو۔ یہ حکم شریعت تھی، مگر حضرت علیؓ نے مٹانے سے انکار کیا۔ حضور ﷺ نے پھر خود مٹا دیا اور ابن عبد اللہ لکھوا دیا۔ تو چونکہ نبی کی بے ادبی ہوتی تھی اس لیے شریعت کو شارع کے مقابلے میں چھوڑ دیا، اور شریعت سے انکار کر دیا۔ اس پر حضور ناراض نہیں ہوئے، بلکہ خوش ہوئے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ قرآن موجود ہے، پوری شریعت موجود ہے۔ اگر چھوٹی سی شریعت مزید نہ ہو تو تب بھی کام چلتا رہے گا۔ کوئی حرج نہیں۔ اب سوال ایک یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی ﷺ جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے، وہ وحی تھی، مگر آپ منع کرنے سے رک گئے۔ اس کا جواب یہ ہے پہلے وہ وحی ہوئی، مگر جب حضرت عمرؓ نے روکا تو وہ منسوخ ہو گئی، اور یہ نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے بھی ان کی مرضی کے مطابق وحی متعدد مرتبہ آئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حکم ہے «بلّغ مآ أنزل إليک» (المائدہ، ۶۷)، وہ کسی کے روکنے سے رک نہیں سکتے۔ چنانچہ عبد اللہ بن ابی کے جنازہ کی نماز جب حضرت نے پڑھنی چاہی تو حضرت عمرؓ نے روکا أما منع ربک ''کیا تیرے رب نے تجھ کو منع نہیں کیا؟'' تو آپؐ نے فرمایا: نہیں، منع نہیں فرمایا، بلکہ مجھے اختیار دیا ہے کہ چاہے پڑھوں چاہے نہ پڑھوں، «استغفر لهم أو لا تستغفر لهم إن تستغفر لهم سبعين مرّةً فلن يّغفر اللّٰه لهم» (التوبہ، ۸۰)، ''تو ان کے لیے استغفار کر یا نہ کر، اگر تو ستر مرتبہ بھی استغفار کرے گا اللہ ان کو ہرگز نہ بخشے گا''۔ مگر جب مجھے اختیار دیا ہے تو میں استغفار کروں گا، یہ میرا کام ہے۔ بخشنا کام اس کا ہے، وہ چاہے بخشے نہ بخشے اس کو اختیار ہے۔ میں کیوں باز رہوں؟ مگر بعد میں حضرت عمرؓ کی مرضی کے مطابق ممانعت آ گئی۔ حضور ﷺ بہت نرم دل اور رقیق القلب تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تو ابو جہل اور ابو لہب کے لیے بھی بخشش کی دعا مانگتے۔ وہ اپنے دشمنوں کے لیے بھی بہتر چاہتے تھے۔ وہ رحمت اللعالمین تھے۔ یعنی ساری دنیا کے لیے رحمت تھے۔ اسی لیے خدا نے اپنے دو نام رؤف یعنی ''ترس کھانے والا'' اور رحیم یعنی ''نفع پہنچانے والا'' حضور انور ﷺ کی ذات سے منسوب فرمائے۔ تو حضور ﷺ کی خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ کی بات کی تصدیق فرما دی۔ ضابطہ جو یہاں کام کر رہا ہے وہ یہی ہے کہ شارع شریعت پر مقدم ہے کہ شارع کی ذات کو تکلیف نہ ہو، اس کو دکھ نہ ہو، شریعت جاتی رہے پروا نہیں۔

خلافت و امامت

اپنی رائے سے آپ بہتر سے بہتر کام کریں وہ نامعتبر ہے، اور اللہ کے حکم سے معمولی کام کریں وہ بہتر ہے۔ بس یہ اصول ہے اسے یاد رکھیں۔ اس سے ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی۔ مثال سے سمجھیں۔ پرائمری نوٹ ہے، کاغذ کا ٹکڑا ہے، ایک کوڑی کا بھی نہیں ہے۔ مگر حکومت کی مرضی سے اس سے آپ سونا خرید سکتے ہیں۔ اور اگر اپنی مرضی سے آپ سونے اور چاندی کا سکہ چلائیں گے، تو ماخوذ ہوں گے۔ حکومت کی رائے

سے کاغذ بھی سونا اور اپنی رائے سے سونا بھی کاغذ سے بدتر ہے۔ تو اللہ پاک کے حکم کے مطابق یعنی رسول کے حکم کے مطابق کیونکہ اللہ کا حکم براہ راست نہیں آتا، رسول کے ذریعے آتا ہے، تو رسول کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے۔ رسول کی پیروی منظور و مقبول ہے اور اس سے ہٹنا ہی غلطی ہے۔ اگر ذرا بھی اس سے ہٹا تو ہٹنے کے بقدر غلطی ہے۔ اس کا کوئی پھل نہیں ہے، بلکہ مثل سراب ہے۔ «إذا جآءہ لم یجدہ شیئاً» ”جب ان کے پاس آئے گا تو کچھ نہ پائے گا“ «و وجد اللّٰہ عندہٗ» ، ”اللہ کو اپنے پاس پائے گا“، «فوفّٰہ حسابہ» (النور، ۳۹)، ”وہ اس کا پورا پورا حساب کر دے گا“۔ اس لیے بغیر ایمان کے کوئی پھل نہیں۔ اور اس میں بھی یہ شرط ہے کہ وہ اس کو قبول کر لے۔یہاں ظاہر میں یہ حکم لگایا سکتا ہے کہ وہ مومن ہے، نیک ہے، وہاں کا حال اللہ کو معلوم ہے انجام کیا ہو گا سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ خاتمہ کس پر ہوا؟ ایمان پر یا کفر پر؟ اس کا کسی کو علم نہیں۔ انبیا کے علاوہ کون غیر معصوم ہے، کسی کا کچھ پتہ نہیں، سوائے ان چند آدمیوں کے جن کی نبی نے خبر دے دی کہ یہ جنتی ہیں۔ وہ بھی بذات خود نہیں صرف اس لیے کہ نبی نے فرمایا ہے۔ اس طرح ظاہر حکم کفر پر ہے لیکن آخر میں اللہ کا کرم ہوتا ہے اور اس کی رحمت جوش میں آتی ہے، خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے۔ تو وہاں کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔یہاں ظاہر میں تو یہ ہے جب تک اقرار نہ کرے، وہ کافر ہی کہا جائے گا۔ اللہ نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ «إنّ اللّٰہ لا یغفر أن یّشرک بہٖ» ، ”اللہ نہیں بخشے گا اس شخص کو جو شرک کرے“، «و یغفر ما دون ذٰلک لمن یّشآء» (النساء، ۴۸)، ”شرک کے علاوہ جتنے گناہ ہیں جن کو چاہے گا بخش دے گا“۔ شرک کے علاوہ بغیر توبہ کے تمام گناہوں میں بخشش کا امکان ہے۔ توبہ سے تو کفر و شرک سب بخشا جائے گا، جب تک غرغرہ نہ لگے، یعنی شعور ہو، اس وقت بھی اگر توبہ کر لے تو کل معاصی معاف۔ «قل للّذین کفروآ إن یّنتھوا یغفر لھم مّا قد سلف» (الانفال، ۳۸)، ”اعلان کر دو کہ جو لوگ کفر سے باز آ جائیں، ان کے پچھلے گناہ سب معاف“ سوائے حقوق العباد کے کسی کا کچھ دینا ہے وہ تو جب تک لین دین معاف نہیں کرے گا معاف نہیں ہو گا۔ باقی عبادات اور تقوٰی کے گناہ جتنے ہوں گے سب معاف ہو جائیں گے۔ ”توبہ“ کے یہ معنی ہیں کہ کئے ہوئے پر ندامت اور ”ترک“ کے مجموعے کا نام توبہ ہے۔ توبہ کے لیے قصد مصمم چاہیے، چاہے وہ گناہ پھر ہو جائے، پھر توبہ کر لے۔ توبہ کا دروازہ ہر وقت، آخری وقت تک کھلا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے۔ «إنّ ربّک لذو مغفرۃٍ للنّاس علیٰ ظلمھم» (الرعد، ۶)، ”تیرا رب بخش سکتا ہے لوگوں کو گناہ کی حالت میں“۔ اللہ کو یہ حق ہے کہ اگر کوئی توبہ نہ کرے تب بھی وہ بخش دے۔ یہ اعلان عام ہے۔ تو خدا کے لیے تو کوئی پابندی نہیں ہے۔ ایک شخص کے نامۂ اعمال میں کہیں بھی ذرہ برابر نیکی نہیں ہو گی اور بخشا جائے گا۔ تو اس کو تعجب ہو گا تو وہ باری تعالیٰ سے سوال کرے گا کہ میں کیونکر بخشا گیا؟ تو جواب ملے گا ایک دن تو نے سوتے میں کروٹ لی تو تیری زبان

سے "اللہ" نکل گیا تھا۔ تجھے وہ یاد نہیں، مجھے یاد ہے۔ اس لیے تجھے بخش دیا۔ تو وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ اس کا تو کچھ پوچھیئے ہی نہیں۔ اس کی بخشش کا کوئی اندازہ ہی نہیں۔ اس سے ہر وقت توقع رحمت و مغفرت ہی رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اس نے فرمایا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، انا عند الظن عبدی اگر وہ مجھے بخشنے والا سمجھتا ہے تو بخشنے والا ہی پائے گا، و انا عند المنکسرۃ قلوبھم اور "میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے پاس ہوں"۔ جو اپنے گناہوں پر نادم ہوتے ہیں، روتے دھوتے ہیں، شکستہ دل ہیں، میں انہیں کے پاس ہوں۔ تو ہم کلیہ قاعدہ تو بتا سکتے ہیں کہ مومن کے ساتھ کیا ہو گا اور کافر کے ساتھ کیا ہو گا، مگر کسی فرد کو نہیں بتا سکتے کہ وہ مومن مرا یا کافر مرا۔ اللہ ہمیں اور آپ کو محفوظ رکھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساری عمر نیک رہا اور آخر عمر میں گمراہ ہو گیا، اور کافر مرا۔ ایک واقعہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ ایک شخص ہر وقت یہ دعا کرتا تھا کہ الٰہی خاتمہ بالخیر کرنا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا: "میاں کیا بات ہے تم مغفرت کی، جنت کی، خدائی خوشنودی یا اور کوئی دعا نہیں مانگتے؟ بس یہی دعا مانگتے ہو؟" اس نے کہا: "میرا ایک بھائی ساری عمر پابند صوم و صلوٰۃ رہا۔ پانچوں وقت اذان بھی دیتا تھا۔ مگر مرتے وقت اس نے قرآن شریف منگوایا اور کہا لوگو گواہ رہنا، میرا اس کتاب پر ایمان نہیں ہے۔ مجھ پر ایسا خوف طاری ہوا کہ میں اس وقت سے صرف یہی دعا مانگتا رہتا ہوں۔

غلام احمد قادیانی اور ختم نبوت

کسی غیر نبی کو نبی ماننا ایسا ہی ہے جیسا کسی نبی کی نبوت سے انکار کرنا۔ ایک شخص حضور ﷺ کو نبی مانتا ہو اور ساتھ ہی کسی اور کو بھی نبی مانے جب کہ یہ اعلان ہو چکا کہ آپ خاتم النبیین ہیں اور لا نبی بعدی "میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا"۔ پھر نبی کسی کو مان لیا تو گویا خدا کو اور نبی دونوں کو جھٹلا دیا۔ ان دونوں قولوں کی تکذیب نبی کی تکذیب ہو گئی۔ تصدیق نہ رہی ضمناً تکذیب ہو گئی۔

ہماری یہ لائن نہیں ہے اور نہ ہمارا اتنا علم ہے۔ مگر ایک بات ہے کہ مسیلمہ کذاب اور اسود عنسیٰ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں دو شخصوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور دونوں حضور اکرم ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرتے تھے۔ مگر حضرت ابو بکرؓ نے ان کے خلاف جہاد کیا اور ان کو قتل کر دیا۔ تو معلوم ہوا کہ محمد ﷺ کی نبوت کے ساتھ غیر نبی کو تسلیم کرنا بے کار ہے اور وہ واجب القتل ہے۔

سوال: بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ شہادت پر نبوت مکمل ہوئی ہے ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: نبوت کی تکمیل اور ختم کا اعلان ہو چکنے کے بعد اگر کوئی شخص ایسا سمجھے، تو وہ کفر کرتا ہے۔ شریعت کی حکومت اس سے باز پرس کر سکتی تھی۔ اس کو تو قادیانی بھی تسلیم کرتا ہے کہ اعلیٰ قسم کی نبوت ختم ہو چکی، وہ گھٹیا قسم کا نبی ہے۔ گھٹیا قسم کی نبوت قیامت تک چلتی رہے گی، یہ بات قادیانی سے بھی بدتر ہے۔ حضرت علیؓ خدا ہیں، اور دو دفعہ سورج ان کے لیے لوٹایا۔ اسی قسم کی اور باتیں منافق یہودیوں نے گھڑیں اور شیعیت کی شکل میں انہوں نے جنم لیا۔ حضور سرور کائنات ﷺ کو جو شخص خاتم النبیین مانتا ہے۔ خاتم کے معنی خاتمِ، خاتم کے معنی انگوٹھی۔ اس نے لوگوں کو بہت دھوکا دیا ہے اور پڑھے لکھے لوگ بھی اسی دھوکے میں آ گئے۔ حضور اور لوگوں کی نبوت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ یہ آیت کہ «مَا کانَ محمّدٌ أبَا أحدٍ مّن رّجالکم وّ لکن رّسول اللّٰہ و خاتم النّبیّن» (الاحزاب، ۴۰)۔ یہ آیت آج پونے چودہ سو برس میں سلسلے وار نقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سلسلے کی تمام کڑیوں کی سچائی کی ہم نے تصدیق کر دی ہے۔ اب اگر وہ سچے ہیں تو یہ قرآن بھی سچا ہے اور جو معانی اس کے انہوں نے بتائے ہیں، وہ بھی حق ہیں۔ اور اگر وہ سچے نہیں ہیں تو قرآن بھی گیا۔ رسول بھی گیا۔ جب دونوں ہی چلے گئے تو اسلام کہاں رہا؟ جن کے کہنے سے الفاظ تسلیم کیے ہیں انہیں کے کہنے سے معنی بھی تسلیم کرنا پڑیں گے۔

انہوں نے بتایا کہ یہاں خاتم کے معنی انگوٹھی یا مہر کے نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب خاتم ہے یعنی ختم کرنے والا، یعنی نبوت ختم ہو چکی۔ اب اگر ان کا یہ بیان قابل تسلیم نہیں ہو گا، تو پہلا بیان کہ حضور نے فرمایا کہ یہ آیت ان پر نازل ہوئی یہ بھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ کس بنیاد پر تسلیم کریں گے؟ جب قرآن گیا، تو نبی ختم۔ جب نبی ہی نہیں رہا تو ظلی نبی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح خلافت بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ جس جماعت نے قرآن نقل کیا ہے، اسی جماعت نے خلیفہ نقل کیا ہے کہ برحق ہے۔ ایک آدمی تو معتبر نہیں ہو سکتا۔ وہ خبر واحد ہے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ طلحہؓ اور زبیرؓ کو بھی ملا لیجیے، تب بھی تین ہوئے۔ پھر بھی خبر واحد ہی رہی۔ باقی تمام اصحاب رسول اللہ نے قرآن نقل کیا کہ یہ ہے جس کو حضور ﷺ نے آسمانی کتاب فرمایا۔ اگر ان سب کو جھوٹا سمجھ لیا جائے تو قرآن ختم ہو جائے گا اور ان سب لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو اگر وہ مجرم ہیں تو ان کی یہ نقل غیر معتبر ہو جائے گی کہ یہ قرآن ہے۔ قرآن ختم ہو گا، تو اصلی نبوت ختم ہو جائے گی۔ جب نبوت ہی ختم ہو گئی تو خلافت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔ جھگڑا ہی ختم ہوا۔ یہ سب گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سب کو بچائے۔ جو شخص سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، اور جو بات اس کے دل میں ہے، اس کی تائید چاہتا ہے وہ کبھی حق پر نہیں آ سکتا، جیسے ایک الماری کتابوں سے بھری ہو اب اس میں آپ کتاب رکھنی چاہیں تو نہیں رکھ سکیں گے۔ جب تک اس میں سے ایک کتاب نکال کر جگہ خالی نہ کریں۔ اسی طرح دماغ میں جو چیزیں بھری ہیں، ان کو نکال دو، تب

نئی بات سمجھ میں آئے گی ورنہ نہیں۔ یہ سب عقل کے خلاف ہے، مزاج کے خلاف ہے، شریعت کے بھی خلاف ہے، ظاہر و باطن ہر اعتبار سے خلاف ہے۔ کوئی صورت بچاؤ کی نہیں ہے۔ اب یہ خرابی کیوں پیدا ہوئی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ اصل میں میری خرابی ہے کہ جو بات میں آپ کو بتاتا ہوں، اس پر خود عمل نہیں کرتا۔ اگر میں خود عامل ہوتا اور میری حرکات حکم الٰہی کے مطابق ہوتیں تو یہ خرابی پیدا ہی نہ ہوتی۔ علما نے عمل نہیں کیا، اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ اس کی وجہ سے یہ غلط عقیدے پیدا ہو گئے۔ باطل مذاہب جو ہیں ان تک میں گنجائش نہیں ہے۔ پھر جو مذہب حق ہے، اس میں کہاں گنجائش ہو سکتی ہے؟ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ البتہ ایک جماعت ہے مقابلہ پر وہ حکما کی جماعت ہے، وہاں دقت ہوتی ہے، پہلوان ہے مقابلہ میں، قوی، عالم، فاضل، ذی حکمت ذی ہوش، صاحب عقل۔ اور یہ لوگ آج کل کے؟ یہ تو علم سے بھی واقف نہیں، نری جہالت ہے۔ جہالت اور ضلالت دونوں ساتھ مل گئی ہیں۔ ایک طبقہ مسلمان ہے، مگر جاہل ہے۔ ان کو اگر کوئی بہکائے تو بہکاوے میں آ جائے گا، وہاں ضلالت نہیں ہے، ہدایت ہے۔ لیکن یہ قادیانی ہوئے، شیعہ ہوئے، یہ سب فرقے جاہل بھی ہیں، گمراہ بھی ہیں۔ صرف ایک فرقہ ہے، وہ گمراہ ہے، جاہل نہیں ہے، وہ فرقہ معتزلہ ہے۔ وہ ذی علم جماعت ہے۔ باقی سب جاہل ہیں، کچھ نہیں جانتے، کوئی معیار نہیں۔ کیا جھگڑا ہے، کیا قصہ ہے، بتاؤ تو سہی؟ اگر تم بھی ختم نبوت کے قائل ہو جیسا کہ اب قادیانی کہنے لگے ہیں تو پھر جو ہمارا عقیدہ وہ تمہارا۔ جھگڑا کس بات کا ہے؟ الگ مسجد کیسی؟ الگ قصہ کیسا؟ شیعہ بھی کہتے ہیں کہ تم بھی حق پر ہو، ہم بھی حق پر ہیں۔ پھر جھگڑا کیا ہے؟ صرف ایک چیز پر اختلاف ہے نا کہ خلافتِ ابو بکرؓ حق ہے یا ناحق؟ یہ تو علمی بحث میں آ جائے گا۔ ضلالت، جہالت گمراہی میں آئے گا۔ باقی جو کچھ بکتے ہیں، سب تقریباً کفر ہے۔ اگر حضرت ابو بکرؓ کی خلافت نہیں مانیں گے تو یہ گمراہی ہو گی، فسق ہو گا۔ اس کے علاوہ حضرت علیؓ کی الٰہیت وغیرہ ہے، یہ کفر ہے۔ اصحابِ رسول کل مومنین ہیں۔ ان کا اجماع جس چیز پر ہو جائے گا، وہ معتبر ہے۔ وہ سب متفق ہیں کہ خدا کا نازل کردہ قرآن یہی ہے۔ اس کا دعویٰ نبی نے کیا تھا اور خاتم کے معنی خاتم ہیں اور حضرت ابو بکرؓ خلیفہ رسول ہیں۔ قرآن کے سلسلے میں حضرت ابو بکرؓ بھی تنہا معتبر نہیں ہیں۔ جس طرح تنہا حضرت علیؓ معتبر نہیں ہیں۔

اصل میں مسئلہ خلافت کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ ہونا چاہیے تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت بہ اجماع حضرت علیؓ ہوئی تھی۔ اگر حضرت علیؓ یہ سمجھتے کہ منصب خلافت ان کا حق ہے اور یہ حق انہوں نے کسی مصلحت کی بنا پر غصب ہونے دیا، تو نعوذ باللہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ حضرت علیؓ نے منافقت سے کام لیا۔ اگر ایسا ہوتا تو اسی وقت جنگ کربلا ہو سکتی تھی۔

اس کے علاوہ اگر حضرت علیؓ خلیفہ اول ہو جاتے تو ہر سہ خلفا کی خدمات سے اسلام محروم ہوتا۔ اس

لیے یہ ماننا پڑتا ہے کہ تقسیم خلافت جس طرح ہوئی ہے، وہ بالکل درست تھی۔ ”چاہیے تھا“ کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہاں تو اجماع جب ہو چکا، تو بات ختم ہو گئی۔ اجماع کے بعد اس کے خلاف غیر معتبر ہے۔ ایک شیعی مجتہد غلام گوہر صاحب سے متعہ کے مسئلے پر بات ہوئی، تو انہوں نے فرمایا کہ ہم سنیوں کی کتابوں سے یہ ثابت کر دیں گے کہ متعہ کو حرام حضرت عمرؓ نے کیا ہے اور یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ متعہ کو میں حرام کرتا ہوں۔ ان مجتہد صاحب کا مقصد یہ تھا کہ اس کی حرمت حضور سے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ سے ثابت ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت پہلی بات تو یہ ہے کہ آج جو مفتی فتوٰی دیتا ہے وہ کیا کہتا ہے؟ یہی کہتا ہے کہ میں فلاں شے کو حرام قرار دیتا ہوں۔ مگر اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہی ہے کہ جس شے کو حضور ﷺ نے حرام قرار دیا، میں اس کو حرام قرار دیتا ہوں۔ تو حضرت عمرؓ کی یہ بات بھی ایسی ہے جیسے آج کے مفتی کی۔ اصل میں بات کہنے کا طریقہ یہی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ حضور کی جگہ پر ہیں، جس کو چاہیں حلال کر دیں اور جس کو چاہیں حرام کر دیں۔ اگر حضرت رسول اللہ ﷺ نے متعہ کو حلال قرار دیا ہو اور یہ حرام کر دیں تو اس صورت میں حضرت عمرؓ نعوذ باللہ کافر ٹھہریں گے۔ اور جب آپ نے اس کا اعلان کیا، اس وقت جملہ اصحاب موجود تھے۔ انہوں نے مخالفت نہیں کی، خاموش ہو گئے، تو وہ سب بھی کافر ہو گئے۔ تو ان کی کوئی نقل معتبر نہیں رہی۔ اور ان ہی سب لوگوں نے قرآن کو یہاں تک پہنچایا ہے، تو یہ قرآن بھی معتبر نہ رہا۔ یہ وہ کتاب نہیں رہے گی جو حضور اقدس پر نازل ہوئی۔ یہ تو ہمارا اسلام بھی اسلام نہ رہا۔ دین مذہب سب ختم۔ (ان کے فرقہ امامیہ اور اثنائے عشریہ اسی قرآن کو مانتے ہیں اور دوسرے فرقے ہیں کوئی اس میں جمع کرتا ہے کوئی اس کی آیات کو بدلتا ہے ان سے فی الحال ہماری بحث نہیں ہے)۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس کے بعد دوسرا مسئلہ چھڑا خلافت کا، تو میں نے کہا کہ اجماع ہو چکا اور اس کے خلاف غیر معتبر ہے۔ اس وقت جو مسلمان موجود تھے وہ کل مسلمان تھے اور اب جو ہیں وہ کل نہیں ہیں۔ بہت اوپر گزر چکے ہیں۔ تو اب جو اجماع ہے وہ اتنا مضبوط نہیں ہو گا جتنا اس وقت کا اجماع قوی تھا۔ تو اس وقت اجماع حضرت ابو بکرؓ پر ہو گیا۔ اس اجماع کے مقابلے میں ۵۲ سال بعد جو اختلاف ہوا وہ غیر معتبر ہے۔ اس کا تو انہوں نے جواب نہیں دیا بلکہ کہنے لگے وہاں صورت دوسری ہے یعنی وہ ظالم، فاسق، غاصب ہیں۔ یعنی مستحق خلافت ہی نہیں ہیں۔ تو میں نے کہا مجتہد صاحب قبلہ «و عصیٰٓ ءادم ربہٗ فغویٰ» (طٰہٰ، ۱۲۱)، ”آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور گناہ گار ہو گیا“۔ تو جب خدا کا پہلا خلیفہ اتنا عظیم الشان کہ ملائکہ سے جس کو سجدہ کرایا گیا، جب اتنا بڑھیا خلیفہ عاصی ہو سکتا ہے تو رسول کا خلیفہ بے چارہ کس گنتی میں ہے؟ جب اللہ کے خلیفہ کا عصیاں اس کی خلافت کے منافی نہیں ہے تو رسول کے خلیفہ کا عصیاں اس کی خلافت کے منافی کب ہو سکتا ہے؟ اس پر انہوں نے کہا کہ میں کچھ آپ سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا آئیے، مگر وہ کبھی تشریف نہیں لائے۔ جب اللہ کا خلیفہ اور نبی عصیاں کر سکتا ہے تو بے چارے ابو بکرؓ تو رسول کے خلیفہ ہیں۔ وہ تو نبی بھی نہیں ہیں، اگر ان سے عصیاں ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔ اور افضلیت کا اصول یہاں غلط ہے، خلیفہ ہونے کے لیے افضل ہونا ضروری نہیں ہے۔

ہمارے اکابر اہل سنت و الجماعت ہیں، ان سے اس میں بھول ہوئی ہے۔ امام کے لیے افضل ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ کچھ باتیں شیعوں سے سیکھ لی ہیں۔ امام نماز تو امام اصغر ہے، امامت کبریٰ خلافت ہے۔ اس کے لیے بھی نیک بختی اور سعادت اور افضلیت ضروری نہیں۔ حضرت امام حسنؓ تو شیعہ سنی دونوں فریقوں کے نزدیک حضرت معاویہؓ سے افضل تھے مگر انہوں نے حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ پھر مروانی اور عباسی خلفا کے زمانے میں بڑے بڑے اکابر نفوس موجود تھے۔ ان کی موجودگی میں مروانی اور عباسی برابر خلفا ہوتے رہے۔ امام ابو حنیفہؒ موجود تھے، خلیفہ منصور کے زمانے میں۔ امام شافعیؒ موجود تھے ہارون کے زمانے میں۔ اس کے علاوہ جو بڑی بین دلیل ہے «و قال لهم نبيّهم إنّ اللّٰه قد بعث لكم طالوت ملكاً» (البقرة، ۲۴۷)، "اس زمانے کے نبی نے لوگوں سے کہا کہ خدا نے طالوت کو بادشاہت کے لیے چن لیا ہے"۔ جس نبی نے قوم کو یہ خبر دی وہ طالوت سے قطعی افضل ہے۔ «و قتل داؤد جالوت» (البقرة، ۲۵۱)، "داودؑ نے جالوت کو قتل کر دیا" داوٗدؑ اور وہ نبی جس نے خبر دی، دونوں سے طالوت قطعی گھٹیا تھا۔ مگر اس کو اللہ نے خلیفہ چن لیا۔ کتنی بین دلیل ہے۔ میں نے یہ دلیل خود تلاش کی ہے۔ تو خلافت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ افضل ہو۔ نماز فرض ہے اور یہ بغیر وضو کے نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی بغیر وضو کے پڑھے تو باعث عتاب ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کسی کے پیسے دینے ہوں اور ایک شخص گندے کاغذ میں روپیہ لپیٹ کر اس پر پیشاب، پخانہ کرے اور لین دار کے منہ پر جا کر مارے کہ لے یہ تیرے روپے، اور کہے کہ میں نے ادا کر دیے تو قابل عتاب ہی رہا۔ اس لیے طہارت شرط ہے۔ طہارت کے لیے پانی ضروری، پانی کے لیے کنواں ضروری، اور کنواں کھدوا نہیں سکتا بغیر مزدور کے اور مزدوروں کے لیے اجرت اور کھانے وغیرہ کا انتظام ضروری ہے۔ تو جس پر نماز فرض ہے اس پر اس کے جتنے لوازمات ہیں، سب فرض ہیں۔ اس کے اسباب مہیا کرنا اس پر فرض ہے۔ اور یہ فرضیت انفرادی نہیں ہے، بلکہ قومی ہے۔ پوری قوم پر فرض ہے۔ تو مزدوروں کے کھانے رہنے کا انتظام ہو گا، ان کی حفاظت کا انتظام ہو گا۔ ان کے دکھ درد کی دیکھ بھال ہو گی۔ یہ سب فرائض میں داخل ہوں گے اور پھر جب وہ وہاں رہیں گے، تو ان میں کسی معاملات میں اختلافات بھی ہوں گے تو ان میں انصاف کرنا اور فیصلہ کرنا، یہ بھی فرائض میں داخل ہو گا۔ اسی کا نام خلافت اور حکومت ہے۔ تو جس پر نماز کا ادا کرنا فرض ہے اس پر جتنے جملہ اسباب ہیں ان کا ادا کرنا بھی فرض ہے۔ ان ہی فرائض میں سے ایک خلافت قائم کرنا بھی ہے۔ تو خلافت قائم

کرنا تمام قوم پر فرض ہے، یہ کام خدا کا نہیں ہے۔ اگر خدا کا فرض ہوتا تو خدا اور نبی دونوں بتا دیتے۔ یہ تو قوم کا فرض ہے وہ انتخاب کر لیں اور جسے چاہیں مقرر کر لیں۔ چنانچہ ابو بکرؓ کو سب نے مل کر منتخب کر لیا۔ اس لیے وہ انتخاب صحیح ہوا۔ اب اس کا انکار کرنا اجماع سے انکار کرنا ہے اور اجماع سے انکار کرنے سے سارا دین اور قرآن ختم ہو جاتا ہے۔ فرمایا: «یخٰدعون اللّٰہ والّذین آمنوا» (البقرۃ، ۹)، ”اللہ کو دھوکا دیتے ہیں اور مسلمانوں کو“، مگر اللہ تو عالم غیب ہے، اس کو کوئی دھوکا کیا دے گا؟ تو سب کا اجماع اس پر ہے۔ اس کے معنی ہیں یخٰدعون الرسول و الذین آمنوا اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔ تو بیشتر قرآن اور معنی اجماع پر موقوف ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے یہ معنی بتائے۔ اگر نہیں بتائے تو ہم سب نے متفق ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ اس کے یہ معنی ہیں۔ اور ہمارے اتفاق کو خدا نے اور نبی نے تسلیم کر لیا۔

اب رہا افضلیت کا مسئلہ، وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ ہر فرد، کل فضل و ساجد، ہر نیک و بد کے پیچھے نماز جائز ہے۔ جواز اور شے ہے اور اولیت اور شے ہے۔ حضرت رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکرؓ سے اتنے افضل ہیں کہ اس افضلیت کی کوئی مقدار نہیں۔ نبی اور غیر نبی کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بڑے سے بڑا مقدس آدمی بڑے سے بڑے فاسق کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی نسبت ضرور رکھتا ہے۔ آج کے مسلمان کے مقابلہ میں حضرت غوث پاکؒ کتنے افضل ہیں؟ بہت افضل ہیں۔ مگر اس میں اور ان میں نسبت ضرور قائم ہو جائے گی۔ ان کی زیادتی کے لیے عدد ہو گا، خواہ وہ کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ مگر نبی کی افضلیت کے لیے کوئی عدد نہیں ہے۔ تو اگر کوئی مقدس آدمی کسی فاسق کے پیچھے نماز پڑھ لے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ وہ اس سے اتنا بڑھیا نہیں ہے، جتنا حضرت ﷺ حضرت ابو بکرؓ سے افضل ہیں۔ تو بگڑنا نہیں چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے۔ اہل سنت و الجماعت ہی صحیح عقیدہ پر ہیں۔ باقی جماعتوں نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ ان کی کہیں کہیں کوئی بات صحیح ہے، باقی غلط ہیں۔ ان کی زیادہ باتیں، بلکہ تقریباً سب صحیح ہیں۔ کہیں کہیں جہاں انہوں نے عقل کو دخل دیا ہے، یہ بھی غلطی کر بیٹھے ہیں۔ کوئی مذہب ہو، اچھا یا برا، جہاں عقل کو دخل دیا، وہیں غلطی کی۔ عقل کو دخل دینے کے بعد غلطی نہیں کرتا، بلکہ عقل کو دخل دینا ہی غلطی ہے۔ اب عقل سے دن بھی روزہ رکھیں، رات بھر عبادت کریں، اس کا کوئی بدلہ نہیں، سب سراب ہے۔ اگر حضور ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کے لیے دن میں آرام کر لیں، قیلولہ کریں، تو اس کا اتنا ثواب ہو گا کہ اس کا کوئی حساب نہیں۔ بیت الخلا جاتے ہوئے بایاں پاؤں اس نیت سے رکھیں کہ حضور ﷺ کی سنت ہے تو اس کا اجر ملے گا۔ اور دس دس دن فاقے کریں خدا کو خوش کرنے کے لیے، ہاتھ سکھا لیں، اس کا کوئی درجہ نہیں، کوئی بدلہ نہیں ملے گا۔ اصل شے نبی کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔ بس ختم۔ «یوم لا یخزی اللّٰہ النّبیّ و الّذین آمنوا معہ» (التحریم، ۸)، ”وہ ایسا دن ہے کہ اللہ نبی کو رسوا نہیں کرے گا اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ہیں“۔ اس کا صاف

مطلب یہ ہے کہ جو کچھ، جس طریقہ پر نبی ﷺ نے کیا، اگر آپ بھی ویسا ہی کریں گے تو آپ رسوا نہیں ہوں گے۔ تو امامت کا مسئلہ بھی صاف ہو گیا۔ اب اسلام کس چیز کا نام ہے؟ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا۔ توحید اس کے ضمن میں آئے گی۔ توحید جب معتبر ہو گی، جب رسالت کو مانے گا۔ جو لوگ بعض حصے کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، «أولٰئک هم الکٰفرون حقاً» (النساء، ۱۵۱)، ''یہی لوگ پکے کافر ہیں'' کہ خدا کو مانیں اور رسول کو نہ مانیں۔ رسول کو ماننے سے ضمناً خدا کو مان لیا۔ جس طرح وضو کر لینے سے غسل کی ضرورت پوری نہیں ہوتی، اور غسل کر لینے کے بعد وضو کی ضرورت ساقط ہو جاتی ہے۔ تو اللہ کو ماننا، گویا وضو کر لیا، اور رسالت کا ماننا جیسے غسل کر لیا۔ توحید کو ماننے کے بعد رسالت کی تصدیق کرنی ہو گی۔ تمام یہودی اور اکثر دوسرے مذاہب خدا کو ایک مانتے ہیں، مگر بالا تفاق کافر ہیں۔ اور نبی کی تصدیق میں ضمنی صدیق خدا کی، فرشتوں کی، دیگر انبیا کی، جنت دوزخ کی، حشر و نشر کی، ہر چیز کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پاور ہاؤس اگر بند ہو تو یہاں گھر میں لاکھ بٹن دبائیں روشنی نہیں ہو گی۔ تو پہلے نبی کو ماننا ہے پھر دوسری چیزوں کا ماننا معتبر ہو گا۔

تو حضور ﷺ پر ایمان لانا چاہیے، انھی کی سنت پر عمل کرنا چاہیے اور ان کے طریقے پر علم حاصل کرنا چاہیے اور جو انھوں نے بتایا ہے، اسی پر اعتقاد رکھنا چاہیے۔ اس کا پتہ کیسے چلے گا؟ وہ اصحاب رسول سے معلوم ہو گا۔ ان کی اکثریت یا کلیت جس لائن پر ہے، وہ صحیح ہے اور جو اس راہ سے ہٹا ہوا ہے، وہی بدعتی ہے، گمراہ ہے، غلط ہے۔ اور عقل کی جتنی باتیں ہیں سب بے کار ہیں جب تک ادھر سے ان کی تصدیق نہ ہو۔ صرف ایک جماعت ہے، وہ بہت زیادہ عقل مند لوگ ہیں۔ وہ معتزلہ ہیں۔ وہ ایسے عاقل ہیں، جیسے ارسطو اور فلاطون ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ فائقِ علم ہیں۔ انھوں نے بڑی نیک نیتی سے مذہب کو عقل میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ان کی نیت خراب نہیں، محض رائے کی غلطی ہے۔ مسلمان ہیں، غلطی کی ہے۔ غلطی کا اللہ معاف کرنے والا ہے۔ اجتہاد کیا، انھوں نے۔ مجتہد غلطی بھی کرے تو اس کو ثواب ملتا ہے۔ اگر صحیح بات کہے تو اس کو دگنا ثواب ملتا ہے جیسے یہاں بھی دو پہلوان لڑتے ہیں تو جیتنے والے کو انعام ملتا ہی ہے، ہارنے والے کو بھی آدھا انعام ملتا ہے۔

حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جو لڑائی ہے وہ بھی اجتہادی غلطی ہے، بدنیتی نہیں ہے۔ مگر یہاں علما اکابرین نے توقف کیا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی نہیں بولنا چاہیے۔ خود غلط راستے سے بچنا چاہیے اور ہدایت کی دعا کرنی چاہیے۔ اپنے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جو غلط راستے پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے اور کبھی ہم بھی غلطی کر جاتے ہیں تو وہ ہماری رائے کی غلطی ہوتی ہے۔ نفس مذہب میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

سنت کے معنی ہیں نبی ﷺ کے خطبات، اقوال، افعال اور وعظ۔ ان سب کے مجموعے کو سنت کہتے

ہیں اور جس پر اصحاب رسول متفق ہو جائیں وہ اجماع ہے۔ تو ہمارا مذہب یعنی اہل سنت و الجماعت کا مذہب حضور ﷺ کی سنت اور صحابہ کا اجماع، یہ ہے ہمارا مذہب۔ قرآن کو سب فرقے مانتے ہیں اور جو دوسرے لوگ ہیں وہ یا اجماع کا انکار کرتے ہیں، تو انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا انکار کر دیا۔ معتزلہ جو عقل میں نہ آئے اس سنت کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں، اور قرآن کی آیات کو تسلیم تو کرتے ہیں مگر اس کی تاویل کر دیتے ہیں کہ اس کا مطلب تم غلط سمجھے، ہم صحیح سمجھے ہیں۔ اس کا مفہوم وہ نہیں، بلکہ یہ ہے۔ تو اس طرح سنت کو رد کرتے اور قرآن شریف کی تاویل کرنے سے کافر نہیں ہوتا، بلکہ فاسق ضرور ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کی چار دلیلیں ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ ہمارا ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو ایک دلیل کو نہیں مانتا، وہ اہل حدیث ہیں، وہ قیاس کو نہیں مانتے۔ وہ ٹھیک نہیں ہے، ان کی رائے غلط ہے۔ چاروں دلیلیں ضروری ہیں، بغیر قیاس کے کام نہیں چلتا۔ جہاں کوئی مسئلہ قرآن و حدیث میں نہیں ملتا اور اجماع بھی نہیں ہو سکتا، وہاں قیاس کرنا پڑے گا۔ مجتہد کو اجتہاد کر کے مسئلہ کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ کیونکہ نصوص جو ہیں وہ ایک کتاب (قرآن) اور حدیث میں محدود ہیں اور احکام لا انتہا ہیں۔ کیونکہ عمل حرکت اور سکون کے مجموعے کا نام ہے۔ تو جو عمل آپ کریں گے وہ یا حرکت ہو گی یا سکون ہو گا۔ چلنا حرکت، بیٹھنا سکون۔ ہر حرکت کے ساتھ پانچ حکم ہیں: فرض، واجب، مباح، مندوب، حرام، مکروہ۔ اور حرکات و سکون کسی حد پر نہیں ٹھہرتے۔ حالات نت نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، کسی حد پر نہیں ٹھہرتے۔ تو حالات لا انتہا، احکام لا انتہا، نصوص منتہی۔ تو پوچھنا پڑے گا کہ ان حالات میں اللہ کا کیا حکم ہے؟ جب منتہی اور لا انتہا کا مقابلہ ہو گا، تو بہت مل جائیں گے اور اکثر باقی رہیں گے۔ جو اکثر باقی رہیں گے، ان کے شبہات [دور کرنے کے] لیے اجتہاد ہے۔ مجتہد قیاس کرے گا اور بتائے گا کہ اللہ کا کیا حکم ہے۔ اب جو ان چاروں سے ثابت نہ ہوا اور پھر اس کو دین میں شامل کیا جائے تو وہ بدعت ہے۔ اگر دین میں شامل نہ ہو تو بدعت نہیں ہے۔ جیسے حساب و اقلیدس کے اصول، وہ چاروں اصولوں میں کہیں نہیں ہیں اور حق ہیں، مسلمات میں ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا دین سے علاقہ نہیں ہے، وہ بدعت نہیں ہیں۔ ہاں اگر ان پر ثواب و عتاب کوئی مرتب کرنے لگے تو یہ بدعت ہو جائے گی۔ اگر عقائد دین کی طرف منسوب کئے جائیں، تو یہ بدعت عقیدہ کی ہو گی۔ اگر اعمال کو منسوب کیا جائے جیسے آج کل ہو رہا ہے تو یہ اعمال کی بدعت ہو گی۔

* * *